ماہنامہ
جہدِ حق

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

HRCP

Monthly JUHD-E-HAQ - August-2019 - Registered No. CPL-13

(قیمت 10 روپے)

جلد نمبر 26......شمارہ نمبر 8......اگست 2019

قبائلی اضلاع کے عوام کی انتخابات سے وابستہ اُمیدیں بر آئیں گی؟

19 جولائی، ملتان: مزدوروں کے حقوق و بہبود کے تحفظ کے لیے قانون سازی پر مشاورت کا اہتمام

30 جولائی، فیصل آباد: مزدوروں کے استحصال کے خاتمے پر ایک مشاورتی تقریب منعقد کی گئی

31 جولائی، لاہور: گروی مزدوری کے خاتمے کے قانون پر تبادلہ خیال کے لیے ایک نشست کا اہتمام

سابق فاٹا میں انتخابات کا انعقاد ایک بڑا سنگ میل ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ماضی میں وفاق کے ذریعے کنٹرول ہونے والے قبائلی علاقہ جات (فاٹا) میں صوبائی انتخابات کے انعقاد پر عمومی طور پر اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ انتخابات کا انعقاد مختصر مدت کے لیے تاخیر کا شکار بھی ہوا مگر اس کے باوجود ان کا منعقد ہونا مغربی خیبر پختونخواہ (کے پی) کے لوگوں کے لیے ایک بڑا سنگ میل ہے۔ اس چیز کا سہرا بھی ای سی پی کو جاتا ہے کہ کہ پولنگ مجموعی طور پر پرامن رہی اور انتخابات ایکٹ 2017 کی مطابقت میں انجام پائی۔

تاہم، ایسی اطلاعات بھی سامنے آئیں کہ باجوڑ اور جنوبی وزیرستان میں بعض امیدواروں نے انتخابات پر اثر انداز ہونے کی کوششیں کی۔ اس لیے ایچ آر سی پی کا ای سی پی سے مطالبہ ہے کہ ایسی شکایات کی شفاف و منصفانہ تحقیقات کی جائیں۔ ایچ آر سی پی کو یہ امید بھی ہے کہ ایسے علاقوں میں انتخابات کے دوران پولنگ اسٹیشنوں میں سیکیورٹی فورسز کی بھاری تعداد میں تعیناتی کے رجحان کو مستقل اقدام کے طور پر اپنانے سے گریز کیا جائے گا اور ذرائع ابلاغ کی رسائی آسان بنائی جائے گی تاکہ مستقبل کے انتخابات کی ممکنہ حد تک شفافیت کو یقینی بنایا جاسکے۔ انتخابات کی آگہی کی ایک پرزور مہم چلانے کی بھی ضرورت ہے تاکہ انتخابات میں عورتیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، ووٹر کے طور پر بھی اور انتخابی امیدوار کی حیثیت سے بھی۔

اس کے علاوہ، حکومت کو اس بات کو یقینی بنانا چاہئے کہ متفقہ طور پر منظور کردہ آئین کا چھبیسواں (ترمیمی) بل، جو سابق فاٹا کو خیبر پختونخوا کی قانون ساز اسمبلی میں زیادہ نمائندگی (16 سے 24 نشستیں) دیتا ہے، جتنا جلدی ممکن ہو سکے سینیٹ میں پیش کیا جائے۔ سیاسی انتقام کے الزامات کے پیش نظر، ایچ آر سی پی ریاست سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ وہ جائز وجوہات کے بغیر علاقے کے منتخب نمائندوں کو بلاجواز حراست میں نہ لے۔

انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی کم شرح کے باوجود، صوبائی انتخابات پاکستان کے اندر اس علاقے کے جمہوری نظم و نسق کے لیے انتہائی اہم ہیں۔ اب یہ نئے منتخب ہونے والے امیدواروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے انتخابی وعدوں کو پورا کریں اور یقینی بنائیں کہ سابق فاٹا کے عوام اپنے ان حقوق سے مستفید ہو سکیں جن کے وہ بطور پاکستانی شہری حق دار ہیں۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 22 جولائی 2019]

فہرست

پریس ریلیز 03

ہماری سیاست کا محور اب پشاور بھی ہوگا، قبائلی اضلاع میں صوبائی انتخابات سے کئی امیدیں وابستہ 04

پاکستان میں انسانی حقوق کی پوشیدہ خلاف ورزیوں کا انکشاف 05

2 کروڑ 20 لاکھ پاکستانی بچے سکول سے باہر ہیں لیکن کوئی سنجیدہ نہیں 08

پاکستان میں صحافیوں پر تشدد کا خاتمہ کیسے ممکن؟ 09

ہماری سیاست کا محور اب پشاور بھی ہوگا'، قبائلی اضلاع میں صوبائی انتخابات سے کئی امیدیں وابستہ

سحر بلوچ

پاکستان میں کچھ عرصہ قبل ہی صوبہ خیبر پختونخواہ میں ضم کیے گئے قبائلی اضلاع میں آج صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہونے جارہے ہیں۔ کئی دہائیوں میں پہلی مرتبہ قبائلی اضلاع کے لوگ صوبائی اسمبلی کی 16 نشستوں پر لڑنے والے امیدواروں کو منتخب کر سکیں گے۔

ان 16 نشستوں میں سے پانچ مخصوص نشستیں ہیں، جن میں سے چار نشستیں خواتین کے لیے جبکہ ایک اقلیتی نمائندوں کے لیے مختص کی گئی ہیں۔انتخابی دوڑ میں اس وقت 297 امیدوار شامل ہیں جن میں اکثریت آزاد امیدواروں کی ہے۔ان امیدواروں میں کُرّم اور خیبر سے تعلق رکھنے والی دو خواتین بھی شامل ہیں جو جمیعت علمائے اسلام (ف) اور عوامی نیشنل پارٹی کی طرف سے انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان کے مطابق اس وقت قبائلی اضلاع میں 28 لاکھ رجسٹرڈ ووٹرز ہیں۔

ان انتخابات کی اہمیت کیا ہے؟

فاٹا میں پہلے بھی قومی اسمبلی کی نشستوں پر انتخابات ہوتے رہے ہیں لیکن یہ نمائندے نہ تو قانون سازی میں کامیاب ہو سکے اور نہ ہی فاٹا کو وہ سہولیات فراہم کر سکے جن کی وہاں اشد ضرورت تھی اور آج بھی ہے۔اس پس منظر میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات سے کئی امیدیں وابستہ کی جا رہی ہیں۔ یہ امیدیں انتخابات کے ذریعے قبائلی اضلاع میں آئینی و قانونی حقوق، سیاسی و شہری حقوق اور پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں تک رسائی کے حوالے سے ہیں۔ایک امیدوار کے بقول "آج کے بعد ہماری سیاست کا محور اسلام آباد کے ساتھ ساتھ پشاور بھی ہوگا۔"

رواں سال مئی میں پچیسویں آئینی ترمیم کے تحت فاٹا کے قبائلی اضلاع کو قومی دھارے میں شامل کیا گیا۔ فاٹا کے اضلاع خیبر پختونخواہ میں ضم کیے گئے ہیں اور ایجنسیوں کو ضلعوں کی حیثیت دی گئی ہے جس کے تحت تمام قانونی اور انتظامی قوانین عمل میں لائے جائیں گے۔

قومی دھارے میں شامل ہونے سے پہلے قبائلی اضلاع کو برطانوی دور کے قانون فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن (ایف سی آر) کے تحت چلایا جا رہا تھا۔ اس قانون کے مطابق قبائلی اضلاع کے لوگ مقامی انتظامیہ اور جرگے کے ذریعے کیے گئے فیصلوں کو پاکستان کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کر سکتے تھے۔ایف سی آر کے تحت سابق فاٹا میں انتظامیہ سے جڑے سیاسی اور اسسٹنٹ ایجنٹ کو عدالتی اختیار حاصل تھا۔ حالانکہ مئی 2018 میں یہ قانون فاٹا انٹیرم گورننس ریگولیشن 2018 کے تحت منسوخ کر دیا گیا تھا لیکن انتظامیہ سے منسلک افسران عدالتی اختیارات کا استعمال کرتے رہے۔قبائلی اضلاع کے انتخابات میں لڑنے والے امیدواروں کے مطابق سابق فاٹا سے امیدوار منتخب تو ہوتے رہے ہیں لیکن ان علاقوں کے لیے کچھ خاص نہیں کر سکے۔

اس بار انتخابات میں حصہ لینے والی بڑی سیاسی جماعتوں میں حکمران جماعت پاکستان تحریک انصاف، پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ نواز، جمیعت علما اسلام (ف) اور عوامی نیشنل پارٹی شامل ہیں۔

امن وامان کی صورتحال اور قبائلی اضلاع

لیکن الیکشن کمیشن کے قبائلی اضلاع میں فوج تعینات کرنے کے فیصلے پر کڑی تنقید ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں حزبِ اختلاف کی جماعتوں کا اعتراض بھی سامنے آیا ہے۔

حزبِ اختلاف کے اس مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے الیکشن کمیشن نے کہا ہے کہ فوج کو صرف پولنگ سٹیشن کے باہر امن وامان کی صورتحال برقرار رکھنے کے لیے تعینات کیا جائے گا۔ تاہم 'حساس' تصور کیے جانے والے پولنگ سٹیشن پر انتظامیہ فوج کو پولنگ سٹیشن کے اندر بھی تعینات کرے گی۔اس بارے میں خیبر پختونخواہ کے گورنر شاہ فرمان نے بی بی سی کو بتایا کہ 'فوج کا کام انتظامی سے زیادہ انتخابات کی شفافیت کو ممکن بنانے کے حوالے سے ہوگا۔'

قبائلی اضلاع میں انتخابات 18 روز کی تاخیر کے بعد 20 جولائی کو ہوں گے۔ یاد رہے کہ یہ تاخیر حکمران جماعت پاکستان تحریکِ انصاف کے کہنے پر اور وزیرستان میں امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورتحال کو جواز بنا کر کی گئی تھی۔

سیاسی جماعتوں کی سابق فاٹا میں تاریخ

جولائی 2018 کے انتخابات میں یہ شاید پہلی بار ہوا تھا کہ فاٹا کی 12 نشستیں سیاسی جماعتوں کے حصے میں آئیں۔

باجوڑ، کُرّم، اورکزئی اور خیبر سے پاکستان تحریکِ انصاف جیت کر سامنے آئی تھی جبکہ باقی نشستیں پشتون تحفظ موومنٹ کے دو، جمیعت علما اسلام کے تین اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک امیدوار نے جیتیں۔

2013 میں ہونے والے عام انتخابات میں چھ نشستیں قبائلی اضلاع کے ملِکوں کے حصے میں آئیں جبکہ تین نشستوں پر مسلم لیگ نواز، ایک پر پاکستان تحریکِ انصاف اور ایک پر جمعیت علما اسلام (ف) کے امیدوار منتخب ہوئے۔ماہرین کے مطابق 2011 میں پاکستان پیپلز پارٹی نے پولیٹیکل پارٹی ایکٹ کو فروغ دیا جس کے نتیجے میں سیاسی جماعتیں باضابطہ طور پر انتخابات میں حصہ لے سکیں اور فاٹا میں ان کی ساکھ مضبوط ہوئی۔اس سے پہلے سابق فاٹا میں آزاد امیدوار انتخابات جیتنے کے بعد اپنی من پسند سیاسی جماعت کا انتخاب کر کے اس میں شامل ہو جاتے تھے۔لیکن 2011 میں پولیٹیکل پارٹی ایکٹ کے تحت سیاسی جماعتیں مضبوط ہوئیں جس کے نتیجے میں آزاد امیدواروں کے لیے میدان تھوڑا تنگ ہو گیا۔

(بشکریہ: بی بی سی نیوز)

جہدِ حق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔
  جو خامیاں / کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔
- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ / اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کر سکتے ہیں۔حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

HRCP کارکن متوجہ ہوں

'''جہدِ حق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتے تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تاکہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جا سکے۔

جہدِ حق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے نیچے دی گئی ویب سائٹ پر موجود ہیں

www.hrcp-web.org

پاکستان میں انسانی حقوق کی پوشیدہ خلاف ورزیوں کا انکشاف

ایم الیاس خان، بی بی سی نیوز، ڈیرہ اسماعیل خان

پاکستان میں نائن الیون حملوں کے بعد شروع ہونے والی 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کے دوران شدت پسندوں سے ہونے والی طویل لڑائی میں ہزاروں افراد مارے جا چکے ہیں۔ تاہم فوجیوں اور شدت پسندوں کے ہاتھوں قتل اور تشدد کے شواہد صرف اب سامنے آنے لگے ہیں۔ بی بی سی نے ایسے ہی کچھ متاثرین تک رسائی حاصل کی ہے۔

2014 کے اوائل کی بات ہے جب ٹی وی نیوز چینل اس جنگ میں پاکستانی طالبان کے خلاف ایک اہم کامیابی یعنی رات کے اندھیرے میں اس گروپ کے اہم ترین کمانڈروں میں سے ایک کی فضائی کارروائی میں ہلاکت کی خبریں دے رہے تھے۔

عدنان رشید اور ان کے خاندان کے پانچ افراد کی افغان سرحد کے قریب شمالی وزیرستان میں کی جانے والی بمباری میں ہلاکت کی اطلاع دی گئی۔

عدنان رشید پاکستانی فضائیہ کے ایک سابق ٹیکنیشن تھے اور معروف شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے اسکول کی طالبہ اور انسانی حقوق کی کارکن ملالہ یوسفزئی کو ایک خط لکھا تھا جس میں انھوں نے 2012 میں ان پر کیے گئے قاتلانہ حملے کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

انھیں سابق صدر پرویز مشرف کو قتل کرنے کے ایک ناکام منصوبے میں ملوث ہونے کے سلسلے میں جیل بھی ہوئی تھی جہاں سے وہ فرار ہو گئے تھے۔

مگر اس بار ایسا معلوم ہوا کہ قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

22 جنوری 2014 کو نیوز چینلز نے سکیورٹی حکام کے حوالے سے بتایا کہ ہمزونی کے علاقے میں عدنان رشید کی خفیہ پناہ گاہ کو دو رات قبل نشانہ بنایا گیا تھا۔

9/11 کے بعد امریکہ کے افغانستان پر حملے کے بعد طالبان جنگجو، القاعدہ کے جہادی اور دیگر شدت پسند سرحد پار کر کے پاکستانی علاقے میں آئے اور اس وقت سے پاکستانی فوج وزیرستان اور دیگر پہاڑی قبائلی علاقوں کا کنٹرول سنبھالے ہوئے ہے۔

صحافیوں سمیت غیر مقامی افراد ان علاقوں میں داخل نہیں ہو سکتے اس لیے سکیورٹی فورسز کے دعوؤں کی آزادانہ تصدیق کرنا انتہائی مشکل ہے۔ جنھوں نے وزیرستان سے ایسی خبریں کی ہیں جن سے فوج کا اچھا تاثر نہیں ملتا، انھیں اکثر اس کی سزا ملی ہے۔

ایک سال بعد معلوم ہوا کہ پاکستانی جنگی طیاروں نے غلط ہدف کو نشانہ بنایا تھا اور عدنان رشید نے خود ایک ویڈیو میں نمودار ہو کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ زندہ ہیں۔

قبائلی علاقوں میں لوگ احتجاج کر رہے ہیں...... مگر انہیں ابھی تک انصاف نہیں مل سکا

پاکستانی فوج نے اس کارروائی میں ایک اہم شدت پسند کو مارنے کے بجائے دراصل ایک مقامی آدمی کے خاندان کو مار ڈالا تھا اور اس کا گھر بھی تباہ کر دیا تھا۔

حکام نے کبھی تسلیم نہیں کیا کہ ان سے غلطی ہوئی۔

بی بی سی نے حملے کا نشانہ بننے والے شخص سے ملاقات کے لیے دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ڈیرہ اسماعیل خان کا دورہ کیا جو کہ پاکستان کے دور دراز اور ممنوعہ قبائلی علاقوں کے لیے گزرگاہ ہے۔

حکام اور آزادانہ تحقیق کرنے والی تنظیموں کے مطابق سنہ 2002 کے بعد سے دہشت گردی کی وجہ سے تقریباً 50 لاکھ افراد کو پاکستان کے شمال مغربی علاقوں سے اپنا گھر بار چھوڑ کر ملک کے دیگر علاقوں میں یا تو سرکاری کیمپوں میں یا پھر پرامن شہروں میں کرائے کے مکانوں میں پناہ لینا پڑی ہے۔

'رات کے تقریباً 11 بجے ہوں گے۔' نذیر اللہ نے کہا جن کی عمر اس وقت 20 برس تھی۔ وہ خاتئ کلے نامی گاؤں میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ دو کمروں کے ایک مکان میں موجود تھے۔ عام طور پر جوڑوں کو علیحدہ کمرہ مشکل سے ہی ملتا ہے مگر اس رات ان کے باقی اہل خانہ مکان کے دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔

'ایسا لگا جیسے میرا مکان دھماکے سے پھٹ گیا ہے۔ میں اور میری بیوی ہڑبڑا کر اٹھے۔ آتش گیر مادے کی شدید بو آ رہی تھی۔ ہم دونوں دروازے کی جانب بھاگے تو ہمیں احساس ہوا کہ ہمارے کمرے کی چھت ماسوائے اس حصے کے جہاں ہمارا پلنگ پڑا تھا، مکمل طور پر گر چکی تھی۔'

دوسرے کمرے کی چھت بھی گر چکی تھی اور صحن میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ نذیر اللہ کو ملبے کے نیچے سے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اپنی بیوی کے ساتھ مل کر انھوں نے ان لوگوں کو بچانے کی کوشش کی جنھیں وہ بھڑکتے شعلوں کی روشنی میں دیکھ سکتے تھے۔

اسی اثنا میں پڑوسی ہلاک شدگان اور زخمیوں کو نکالنے کے لیے مدد کرنے آ گئے۔

نذیر اللہ کے گھر والوں میں سے ایک تین سالہ بچی سمیت چار افراد ہلاک ہوئے۔ ان کی بھتیجی سمیہ جس کی ماں بھی ہلاک ہوئی تھی، اس وقت ایک سال کی تھی۔ سمیہ کے کولہے کی ہڈی ٹوٹی مگر وہ بچ گئی تھی۔ ملبے سے خاندان کے چار مزید افراد کو زخمی حالت میں نکالا گیا اور ان سب کو شدید چوٹیں آئی تھیں۔

اس واقعے کے بعد سے نذیر اللہ کے گھر والے ڈیرہ اسماعیل خان منتقل ہو چکے ہیں جہاں زندگی قدرے پرامن ہے۔

قبائلی علاقے میں 20 سال سے جاری لڑائی کے باعث اس خطے کے بہت سارے پاکستانی شہریوں کی طرح انھیں متعدد بار دہشت گردی کی وجہ سے اپنا علاقہ چھوڑنا پڑا ہے۔

حکام اور آزادانہ تحقیق کرنے والی تنظیموں کے مطابق سنہ 2002 کے بعد سے دہشت گردی کی وجہ سے تقریباً 50 لاکھ افراد کو پاکستان کے شمال مغربی علاقوں سے اپنا گھر بار چھوڑ کر ملک کے دیگر علاقوں میں یا تو سرکاری کیمپوں میں یا پھر پرامن شہروں میں کرائے کے مکانوں میں پناہ لینا پڑی ہے۔

اس جنگ میں کتنے لوگ ہلاک ہوئے ہیں اس کی بابت سرکاری اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم محققین، مقامی حکام اور سماجی کارکنوں کے اندازوں کے مطابق ہلاک ہونے والے عام شہریوں، شدت پسندوں اور سکیورٹی اہلکاروں کی کل تعداد 50

ہزار سے زیادہ ہے۔

مقامی سماجی کارکن کہتے ہیں کہ فوج کی جانب سے متواتر فضائی اور زمینی کارروائیوں میں بہت سارے عام شہری مارے گئے ہیں۔ وہ اپنے دعوؤں کے شواہد کے طور پر ویڈیو اور دستاویزی شواہد جمع کرتے رہے ہیں۔

ان کارکنان کا تعلق ایک نسبتاً نئی اور معروف انسانی حقوق کی مہم پشتون تحفظ موومنٹ سے ہے جو 2018 کے آغاز میں سامنے آئی اور تب سے قبائلی علاقوں میں انسانی حقوق کی ایسی مبینہ خلاف ورزیوں کی تشہیر کر رہی ہے جن کے بارے میں ماضی میں متاثرین بتانے سے ڈرتے تھے۔

تنظیم کے اہم رہنما منظور پشتین کا کہنا ہے کہ '15 برس کی تکالیف اور تذلیل کے بعد ہم میں اتنی ہمت آئی ہے کہ بات کر سکیں اور آگاہی دے سکیں کہ کیسے فوج نے براہِ راست کارروائی کر کے اور شدت پسندوں کی حمایت کی پالیسی اپنا کر ہمارے آئینی حقوق کو کچلا ہے۔'

مگر یہ تنظیم شدید دباؤ کا شکار ہے۔ پی ٹی ایم کا دعویٰ ہے کہ رواں برس 26 مئی کو فوج نے شمالی وزیرستان میں مظاہرین کے ہجوم پر فائرنگ کی جس سے ان کے 13 کارکنان ہلاک ہو گئے۔

فوج کا کہنا ہے کہ تین کارکن اس وقت ہلاک ہوئے جب ایک فوجی چوکی پر حملہ کیا گیا۔ پی ٹی ایم اس الزام کی تردید کرتی ہے مگر اس کے دو رہنماؤں کو جو کہ اراکینِ پارلیمان بھی ہیں، گرفتار کر لیا گیا ہے۔

پی ٹی ایم کی جانب سے جن واقعات کی نشاندہی کی گئی اور جن کے بارے میں بی بی سی نے آزادانہ تحقیقات بھی کیں، جب انھیں پاکستانی فوج کے ایک ترجمان کے سامنے رکھا گیا تو انھوں نے ان پر جواب دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ الزامات 'انتہائی متعصّبانہ' ہیں۔

9/11 طالبان کو پاکستان میں کیسے لے آیا؟

یہ سب اس وقت شروع ہوا جب سنہ 2001 میں نیویارک اور واشنگٹن میں القاعدہ نے حملے کیے۔ اکتوبر 2001 میں جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو اسامہ بن لادن کو پناہ دینے والے طالبان جیسے بغیر لڑائی کے ہی غائب ہو گئے۔

تنظیم کے اہم رہنما منظور پشتین کا کہنا ہے کہ '15 برس کی تکالیف اور تذلیل کے بعد ہم میں اتنی ہمت آئی ہے کہ بات کر سکیں اور آگاہی دے سکیں کہ کیسے فوج نے براہِ راست کارروائی کر کے اور شدت پسندوں کی حمایت کی پالیسی اپنا کر ہمارے آئینی حقوق کو کچلا ہے۔'

سنہ 1996 میں کابل فتح کرنے والے طالبان کی حکومت کو تسلیم کرنے والے تین ممالک میں سے ایک پاکستان کے مفاد میں تھا کہ طالبان کو ختم نہ ہونے دیا جائے تاکہ وہ افغانستان میں انڈیا کے اثر و رسوخ کو زیادہ بڑھنے نہ دیں۔

تو ادھر جہاں پاکستان امریکی فوجی امداد پر کئی دہائیوں تک انحصار کرتا رہا اور جنرل پرویز مشرف امریکی 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کا حصہ بھی بن گئے، پاکستان نے پھر بھی طالبان کو نیم خودمختار قبائلی علاقوں خاص کر شمالی اور جنوبی وزیرستان میں پناہ گاہیں بنانے دیں۔

مگر افغان طالبان اکیلے ہی سرحد پار نہیں آئے۔ دیگر عسکریت پسند تنظیموں کے جنگجو بھی قبائلی علاقوں میں آنے لگے اور ان میں کچھ تو پاکستان کی ریاست کے بھی بہت خلاف تھے۔

عالمی عزائم رکھنے والے جہادیوں نے وزیرستان میں بیٹھ کر حملوں کی منصوبہ بندی شروع کر دی جس کے بعد امریکہ پاکستان سے کہتا رہا کہ ان کے خاتمے کے لیے مزید اقدامات کیے جائیں۔

سکیورٹی امور کی تجزیہ کار عائشہ صدیقہ کہتی ہیں کہ جیسے جیسے دہشت گردی بڑھنے لگی پاکستان 'عسکریت پسندوں سے لڑائی اور دوسری طرف مستقبل میں سودے بازی کے لیے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے ان میں سے کچھ کے ساتھ اتحاد' کے درمیان پھنس گیا۔

سنہ 2014 میں پاکستان نے شمالی وزیرستان میں ایک نیا آپریشن شروع کیا جس نے شدت پسند تنظیموں اور ان کی محفوظ پناہ گاہوں پر دباؤ ڈالا اور اسے ملک بھر میں حملوں میں کمی کی وجہ قرار دیا گیا۔

'طالبان اور فوج ایک ہی کام کر رہے ہیں'

سنہ 2001 میں جب طالبان قبائلی علاقوں میں آئے تو انھیں مقامی لوگوں نے ایک محتاط انداز میں خوش آمدید کہا۔ مگر جلد ہی قبائلی لوگ ان سے نالاں ہو گئے کیونکہ انھوں نے اپنے قدامت پسند مذہبی عقائد لوگوں پر نافذ کر کے قبائلی معاشرے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

ابتدائی مراحل میں مقامی نوجوان سینکڑوں کی تعداد میں شدت پسندوں کے ساتھ شامل ہونے لگے اور اسی لیے ان تنظیموں میں قبائلی دشمنیوں کا رنگ آنے لگا جو کہ بعد میں ہونے والی داخلی لڑائیوں سے واضح تھا۔

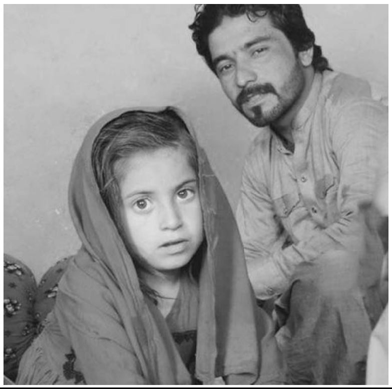

نذیر اور ان کی بھتیجی سمیہ زندہ بچ گئے، مگر ان کے خاندان کے چار افراد مارے گئے

دوسرے مرحلے میں طالبان نے قبائلی عمائدین کو ختم کرنا شروع کیا جو کہ ان جنگجوؤں کی قبیلوں پر قبضے کرنے کی کوشش میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ سنہ 2002 سے لے کر اب تک کم از کم ایک ہزار قبائلی عمائدین کو شدت پسندوں نے قتل کیا ہے اور کچھ غیر سرکاری تنظیمیں اس تعداد کو تقریباً 2000 قرار دیتی ہیں۔

جولائی 2007 میں شمالی وزیرستان میں ایسا ہی ایک قتل اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ عسکریت پسندوں نے کیسے قبائل کو قابو کیا۔

شمالی وزیرستان کے علاقے رزمک سے تعلق رکھنے والے وزیر قبیلے کے ایک رکن محمد امین کہتے ہیں کہ 'جب انھوں نے میرے بھائی کو اغوا اور قتل کیا اس وقت بھی علاقے میں میرا قبیلہ مضبوط تھا۔ مگر جب فوج نے انھیں (شدت پسندوں کو) ہمارے لوگوں کے خلاف کارروائی کی آزادی دے دی تو ہماری کمر ٹوٹ گئی۔'

محمد امین کے بھائی کی لاش شدت پسندوں کے ہاتھوں ان کے اغوا کے اگلے دن ایک ٹرک میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ محمد امین اور ان کے قبیلے والوں نے اغوا کاروں کا سراغ لگا لیا اور پھر ان کے ساتھ لڑائی کی۔

اس جھڑپ میں محمد امین کے بیٹے اسد اللہ، ان کے ایک کزن اور چار طالبان جنگجو مارے گئے۔

اس کے بعد رزمک میں طالبان کی پرتشدد کارروائیاں روکنے کے لیے قبیلے کی جانب سے عسکری حکام سے کیے گئے مطالبات اس وقت ٹھنڈے پڑ گئے جب رزمک میں ہی موجود طالبان نے جوابی کارروائیاں کرنے کی دھمکیاں دیں۔

ایک دہائی بعد بھی محمد امین کو اس بات پر کوئی شک نہیں ہے کہ ماسوائے کبھی کبھی آپس میں جھڑپوں کے 'طالبان اور فوج ایک ہی کام کر رہے ہیں۔'

پی ٹی ایم کے کارکنان نے ایسے بھی متعدد واقعات کے شواہد جمع کیے ہیں جن میں سکیورٹی فورسز نے مقامی آبادی کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا ہے۔

مثال کے طور پر مئی 2016 میں شمالی وزیرستان میں تیتی مداخیل کے علاقے میں فوجی چوکی پر حملے کے بعد حملہ آور کی تلاش میں فوج نے پورے ایک گاؤں کی آبادی کو اکھٹا کیا۔ واقعے کے ایک عینی شاہد نے، جس کا اپنا بھائی بھی اسی آپریشن میں پکڑا گیا تھا، بی بی سی کو بتایا کہ فوجیوں نے ہر کسی کو مارا پیٹا اور بچوں کے منہ میں کیچڑ ڈال دی۔

ایک ویڈیو پیغام میں ایک شخص نے بتایا کہ اس واقعے میں دو لوگ مار پیٹ سے ہلاک ہوئے جن میں سے ایک اس کی حاملہ والدہ تھیں۔ کم از کم ایک اور شخص ابھی تک لا پتہ ہے۔

اس واقعے میں بچ جانے والوں کی کہانیاں بھی دردناک ہیں۔ میں رزمک میں ہی ستر جان محسود سے ملا۔ ہم ایک سفید خیمے میں بیٹھے تھے جہاں انھوں نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ ان کے دو بچے بھی ساتھ ہی بیٹھے تھے۔

اپریل 2015 کی ایک شام شدت پسندوں نے جنوبی وزیرستان میں شکتوئی کے مقام پر ایک فوجی چوکی پر فائرنگ کی۔ ستر جان محسود کا دعویٰ ہے کہ فوج نے قریبی گاؤں سے مشکوک افراد کو پکڑا اور ان میں سے دو کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ 21 اپریل کو انھوں نے اپنی تفتیش کا دائرہ بڑھایا اور ستر جان محسود کے گاؤں میں تلاشی کا عمل شروع کر دیا۔ انھیں ستر جان کے گھر کے عقب میں واقع پہاڑی سے کچھ ہتھیار ملے۔ ستر جان محسود کہتے ہیں کہ 'اس وقت میرے گھر میں صرف میرا بھائی ادر جان، اس کی بیوی اور دو بہوئیں موجود تھیں۔' فوجیوں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ستر جان کے بھائی نے دروازہ کھولا۔ فوجی فوراً اندر گھس آئے، ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور ہاتھ بھی باندھ دیے۔ فوجیوں نے گھر کے دیگر مردوں کا پوچھا اور پھر علاقے سے ادر جان کے چاروں بیٹوں کو لے آئے۔

عینی شاہدین نے بعد میں ستر جان کو بتایا کہ ان کے بھتیجوں کو مارا پیٹا گیا اور ان کے سب سے بڑے بھتیجے رضوار جان کے سر پر لگنے والی چوٹ مہلک ثابت ہوئی۔

ان سب کو ایک پک اپ ٹرک میں ڈالا گیا جو کہ فوجیوں نے پکڑ لیا تھا اور انھیں علاقے میں واقع ایک فوجی کیمپ میں لے جایا گیا۔

اس ٹرک کے ڈرائیور نے ستر جان کو بعد میں آکر بتایا کہ کیونکہ رضوار جان پہلے ہی 'ادھ موا تھا اور خود سیدھا بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا' اسی لیے فوجی انھیں ساتھ نہیں لے کر گئے۔

اس نے ستر جان کو بتایا کہ 'انھوں نے مجھے کہا کہ گاڑی روکو، رضوار جان کو سر میں گولی ماری اور اس کی لاش سڑک پر پھینک دی۔'

اس وقت ستر جان دبئی میں ایک فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ جب انھیں پتا چلا کہ کیا ہوا ہے تو وہ واپس آئے۔ انھوں نے ایک فلائٹ لی، بس لی اور پھر 15 گھنٹے پیدل سفر کر کے اپنے علاقے میں پہنچے جہاں 23 اپریل کو رضوار جان کی لاش ملی تھی۔ وہاں مقامی لوگوں نے انھیں بتایا کہ کرفیو کی وجہ وہ رضوار جان کی لاش وادی کے پار ان کے گاؤں نہیں لے جا سکے اور انھیں وہیں پر دفن کر دیا گیا۔

> ستر جان محسود کہتے ہیں کہ 'اس وقت میرے گھر میں صرف میرا بھائی ادر جان، اس کی بیوی اور دو بہوئیں موجود تھیں۔' فوجیوں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ستر جان کے بھائی نے دروازہ کھولا۔ فوجی فوراً اندر گھس آئے، ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور ہاتھ بھی باندھ دیے۔ فوجیوں نے گھر کے دیگر مردوں کا پوچھا اور پھر علاقے سے ادر جان کے چاروں بیٹوں کو لے آئے۔

ستر جان جب گھر پہنچے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ ان کے بھائی اور بھتیجوں کی بیویاں رشتہ داروں کے پاس رہنے چلی گئی تھیں۔

ستر جان جانتے تھے کہ خواتین کو مکمل بات معلوم نہیں ہو گی کیونکہ کرفیو کی وجہ سے وہ دوسرے گاؤں تک جا نہیں سکتی تھیں اور علاقے میں کوئی موبائل نیٹ ورک نہیں تھا۔

جب وہ اپنی بھابھی سے ملے تو انھوں نے وہی بتایا جو انھیں پتا تھا کہ ادر جان کو فوج لے گئی ہے اور گھر کے دیگر مرد لا پتہ ہیں۔

'میں نے سوچا کہ اسے بتاؤں یا نہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ جب ادر جان اور میرے بھتیجے واپس آ جائیں گے تو رضوار جان کی بری خبر دینا آسان ہو جائے گا۔ مجھے پتا تھا کہ فوج کے پاس ان کے خلاف کچھ نہیں ہے اور وہ انھیں جلد چھوڑ دیں گے۔'

اس لیے ستر جان نے اپنی بھابھی کے لیے ایک کہانی گھڑی کہ جب فوج گھر پر آئی تو نوجوان کراچی چلے گئے۔ انھوں نے اپنی بھابھی کو یقین دلایا کہ ان کے شوہر جلد واپس آ جائیں گے۔

26 اپریل 2015 کو انھوں نے اپنے اہلخانہ کو رزمک منتقل کر دیا۔ ہفتے مہینوں میں اور مہینے برسوں میں بدل گئے مگر اب تک فوج نے انھیں ان کے بھائی اور تین بھتیجوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔

ستر جان اکیلے نہیں ہیں۔ مقامی کارکنان کا کہنا ہے کہ سنہ 2002 سے اب تک فوج نے 8000 لوگوں کو اٹھایا ہے جن کا کچھ پتہ نہیں ہے۔

ادھر ستر جان اپنے گھر کی عورتوں کے اس سوال سے بچتے پھر رہے ہیں کہ وہ اپنے گاؤں کیوں نہیں جا سکتیں۔

'میں نے انھیں کہا ہے کہ شکتوئی میں ہمارا گھر آرمی نے گرا دیا ہے جو کہ جزوی طور پر سچ ہے۔ مگر اصل وجہ یہ ہے کہ اگر یہ وہاں جائیں گی تو پڑوسی افسوس کے لیے آئیں گے اور انھیں حقیقت پتا چل جائے گی۔'

وہ کہتے ہیں کہ بہتر ہوتا کہ اگر انھیں یہ پتا چل جاتا کہ ان کے بھائی اور بھتیجوں کو جیل ہو گئی ہے یا انھیں مار دیا گیا ہے۔ ان کا اصل درد لاعلمی ہے۔

'میں اپنی بھابھی کو نہیں کہہ سکتا کہ ان کے بیٹے لا پتہ ہیں یا مر گئے ہیں۔ میں ان کی دونو جوان بیویوں کو نہیں کہہ سکتا کہ تم بیوہ ہو گئی ہو۔'

یہ انفرادی کہانیاں حیران کن تو ہیں مگر انوکھی نہیں۔ پی ٹی ایم کہتی ہے کہ قبائلی علاقوں میں سینکڑوں لوگ ایسی ہی کہانیاں سناتے ہیں مگر انھیں سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔

یہ اس جنگ کے نتائج ہیں جنھیں دنیا سے پوشیدہ رکھنے کے لیے پاکستان نے بہت کوششیں کی ہیں۔ افغان سرحد پر لڑی گئی یہ جنگ معلومات کے لحاظ سے کئی برسوں سے ایک بلیک ہول ہے۔

اور جب گزشتہ سال پی ٹی ایم کھل کر سامنے آئی تو میڈیا کی کوریج پر پابندی لگا دی گئی۔ میڈیا میں جنھوں نے اس پابندی کو نہیں مانا انھیں دھمکیاں اور معاشی دباؤ کا نشانہ بننا پڑا۔

فوج نے سرِ عام پی ٹی ایم کی حب الوطنی پر سوال اٹھائے ہیں اور الزام عائد کیا ہے کہ اس کے دشمن افغان اور انڈین خفیہ ایجنسیوں سے تعلقات ہیں۔ پی ٹی ایم کے کچھ کارکنان جو کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے شواہد جمع کر رہے ہیں یا تنظیم کا سوشل میڈیا چلا رہے ہیں انھیں جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔

کئی برسوں سے ظلم سہنے والے ان کارکنان جو برسوں کی خاموشی کے بعد بالآخر لمبی اور خفیہ جنگ کی زیادتیوں کے خلاف بول اٹھے ہیں، کے ساتھ کیے جانے والے سلوک سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جنگ کے متاثرین کو انصاف کے لیے انتہائی کٹھن جدو جہد کرنی پڑے گی۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ بی بی سی نیوز)

2 کروڑ 20 لاکھ پاکستانی بچے سکول سے باہر ہیں لیکن کوئی سنجیدہ نہیں

فیصل باری

پاکستان میں 5 سے 16 برس کی عمر کے 2 کروڑ 20 لاکھ بچے اسکول نہیں جاتے۔ اگرچہ گزشتہ 10 برسوں کے دوران پرائمری اسکولوں کی شرح داخلہ میں اضافہ ہوا ہے لیکن اسکول سے باہر موجود بچوں کی اس قدر بڑی تعداد میں یہ اضافہ خاطر خواہ نہیں ہے۔

5 سے 16 برس تک کی عمر کے بچوں کو اسکول میں بھیجنے میں ابھی اور کتنے برس لگیں گے؟ 10؟ 20؟ یا پھر اس سے بھی زیادہ؟ ہم جس رفتار کے ساتھ بچوں کو اسکولوں میں داخل کر رہے ہیں، اس رفتار کے ساتھ ہم بھی ان بچوں کو اسکول تک پہنچانے میں کامیاب ہوں بھی سکیں گے یا نہیں؟

یہاں دو الگ الگ مسائل درپیش ہیں۔ وہ بچے جو اس وقت اسکول سے باہر ہے وہ قوی امکان ہے کہ حصولِ تعلیم کے بغیر ہی اب سنِ بلوغت تک پہنچ جائیں گے۔ تعلیم سے محروم افراد کی اتنی بڑی تعداد ایک مسئلہ ہے، جس سے نمٹنے کے لیے تعلیم بالغان اور اس قسم کے پروگرامز کا سہارا لینا پڑے گا۔

اس کے بعد دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اب بھی 5 برس کی عمر کے ہر بچے کو اسکولوں میں داخل نہیں کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسکول سے باہر 5 سے 16 برس کی عمر کے بچوں کی موجودہ تعداد میں انہیں بھی شامل کرتے رہنا ہے۔ یہ مسئلہ اسی صورت حل ہوسکتا ہے کہ اگر تمام کم عمر بچے 5 سال کی عمر تک اسکول جانا شروع کردیں۔

تاہم اعداد وشمار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمیں اس کام کے لیے بہت زیادہ کام اور وسائل درکار ہیں۔ یاد رکھیے، 2 کروڑ 20 لاکھ بچے اسکول سے باہر ہیں۔ یعنی یہ تعداد کراچی کی آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ لاہور اور فیصل آباد دونوں کی آبادیوں کو ملا دیا جائے تب بھی اسکول سے باہر بچوں کی تعداد زیادہ بنتی ہے۔

اب اگر ہم آپ لاہور اور فیصل آباد دونوں کی پوری پوری آبادیوں کو ان اسکولوں میں داخل کروانا چاہتے ہیں جہاں پہلے سے ہی بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں تو اس کام کو انجام دینے کے لیے زبردست عزم، منصوبہ بندی اور وسائل مطلوب ہوں گے۔

چاہے منصوبہ بندی کسی بھی نوعیت کی جائے، یہ تبدیلی ایک دن یا سال میں ممکن نہیں ہو پائے گی۔ اس کے لیے 5 سے 10 برسوں پر مشتمل پلان مطلوب ہوگا۔

تو جناب اب یہاں آ کر ایک پلان کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ایک ایسا پلان جو وفاقی اور صوبائی حکومتیں مرتب کریں اور پھر اس پر ثابت قدم رہیں۔

اس وقت کسی بھی حکومت کے پاس کوئی ایک بھی پلان موجود نہیں ہے۔ تمام حکومتیں مسئلے سے آگاہ ہیں۔ یہ حکومتیں مسئلے کو حل کرنے کے لیے اپنی اپنی بظاہر کوششوں کو دکھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے منصوبوں کے بارے میں باتیں تو کرتی رہتی ہیں لیکن کسی نے بھی ان بچوں کو اسکولوں میں داخل کرنے کے لیے کسی قسم کا مالی منصوبہ مرتب نہیں کیا اور نہ ہی اس کام کو کامیابی کے ساتھ انجام دینے کے لیے کسی قسم کا ایکشن پلان تیار کیا ہے۔

جیسے کہ ان تمام بچوں کو اسکول بھیجنے کے لیے حکومت کے کتنے پیسے خرچ ہوں گے؟ یہ سب کس طرح ممکن ہوگا؟ یہ پیسہ آئے گا کہاں سے؟

اسکول سے باہر موجود بچوں کو اسکول میں بٹھانے کے لیے موجودہ تعلیمی بجٹ ناکافی ہے۔ اگر تعلیمی بجٹ میں اضافے کی تھوڑی، بہت یا بالکل بھی گنجائش نہیں نکالی جاتی، جو اس وقت تسلیم شدہ مالی حقیقت دکھائی دیتی ہے، تب تک اسکول سے باہر بچوں کی اس بڑی تعداد کو اسکول میں داخل کروانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے ہمیں قبول کرنا چاہیے۔

تاہم اگر ہم دیگر وسائل ڈھونڈ لیتے ہیں تو اس کے بعد اتنی ہی اہمیت کے حامل پلان مرتب کرنے کی ضرورت پڑے گی اور یہ طے کرنا ہوگا کہ اس پر کس طرح عمل درآمد کیا جائے۔

موجودہ اسکولوں میں کتنے بچے داخل کیے جائیں گے؟ نئے اسکولوں کی کتنی تعداد مطلوب ہوگی؟ کتنی تعداد میں نئے اساتذہ بھرتی کیے جائیں گے؟ کتنے ایسے اسکول ہیں جن میں 2 شفٹوں میں درس وتدریس کا عمل ممکن ہے؟ کسی قسم کی نجی و سرکاری شراکت داری کے تحت چلنے والے نجی اسکولوں میں جانے والے بچوں کے اخراجات حکومتیں برداشت کریں گی؟

5 سے 10 برس کی عمر کے بچوں کا کیا جائے گا، خیالی اعتبار سے یہ پتہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔ ہم انہیں ہر بار ریگولر اسکولوں اور/ یا تھوڑے تیز رفتار تعلیمی پروگرامز کا آغاز کرسکتے ہیں تاکہ انہیں ریگولر نظام کا حصہ بنایا جاسکے۔

اسکول سے باہر 10 یا اس سے زائد برس کے بچوں کے مسائل مختلف ہیں۔ ان میں سے کچھ تعداد پہلے سے کام کر رہی ہے اور اپنے اہل خانہ کی آمدن میں اپنا حصہ ڈال رہی ہے۔ انہیں دوبارہ مرکزی دھارے کے اسکولوں میں لانا کافی مشکل کام ثابت ہوگا۔

ایک کمرہ جماعت جہاں سارے بچے 5 سال کے ہوں وہاں ایک 10 سالہ بچے کو بٹھانے میں ویسے بھی دقت ہوتی ہے۔ ہاں اگر یہ 10 سالہ بچہ پہلے سے اپنے اہل خانہ کے لیے کما رہا ہے اور وہ کسی قسم کے ووکیشنل ہنر کا حامل ہے تو ایسے بچے کو پہلی جماعت سے پڑھاتے ہوئے ریگولر تعلیم کے دھارے میں لانا بھی کافی غیر حقیقت پسندانہ تصور معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں ایسے بچوں کے لیے مختلف نوعیت کے پروگرامز درکار ہوں گے۔ ان پروگرامز کے تحت ان بچوں کو لکھنے پڑھنے کے ساتھ ہندسوں کی تعلیم کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے چند بچے اپنی تعلیم کو مزید آگے بھی جاری رکھنا چاہیں، لیکن دیگر تعلیم کے ساتھ پیشہ ورانہ ہنر کی تربیت کے پروگراموں کو زیادہ اہمیت دینا چاہیں گے۔

10 یا اس سے زائد عمر کے بچوں کو اسکولوں میں داخل کروانے کے لیے کون سا طریقہ ٹھیک رہے گا اس کا پتہ لگانے کے لیے ہمیں مختلف اقسام کی مراعات اور ریگولیٹری اسکیموں اس کے ساتھ ساتھ مختلف پروگرامز کے ساتھ ڈھیر سارے تجربات کرنے ہوں گے۔

یہ پروگرامز جغرافیائی اور صنفی اعتبار سے مختلف نوعیت کے بھی ہوسکتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ملک کی کوئی بھی حکومت ایسے مخصوص نوعیت کے پروگرام مرتب کرنے کا سوچ تک نہیں رہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہوا ہے کہ ڈبل شفٹ اسکولوں اور تجربے کی ضرورت کے بارے میں بات چل رہی ہے، البتہ کہیں بھی کوئی بھی تجربہ ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ آخر کب اس قسم کے پروگرامز کو حتمی شکل دی جائے گی؟ عمل درآمد میں تو پھر برسوں درکار ہوں گے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اگلے چند برسوں کے دوران کچھ نئے اور بڑے منصوبوں پر عمل درآمد شروع ہوجائے تو ہمیں ابتدائی سوچ کے مرحلے سے آگے نکلنا ہوگا۔

مختلف موقعوں پر ہونے والی گفتگو میں اسکول سے باہر موجود بچوں کے مسئلے پر بات تو ہوتی ہے لیکن کسی بھی حکومت نے اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنا بھی شروع نہیں کیا ہے۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے حقیقی نوعیت کے منصوبوں پر کسی قسم کا کام ہی نہیں ہو رہا ہے۔ اس بارے میں کوئی فکر نظر نہیں آتی کہ اس مسئلے کے حل کے لیے کہاں سے وسائل حاصل کیے جائیں گے یا پھر کس قسم کے پرگرام مطلوب ہوں گے، بلکہ ہم تو تمام 5 سالہ بچوں کا اسکولوں میں داخلہ یقینی بنانے کی حالت میں بھی نہیں ہیں۔ ناخواندگی سے جڑے مسائل آنے والے طویل وقت تک ہمارے ساتھ رہیں گے۔

(بشکریہ ڈان)

پاکستان میں صحافیوں پر تشدد کا خاتمہ کیسے ممکن؟

ساگر سہندڑو

پاکستان میں کسی معاملے پر رپورٹنگ یا تجزیہ کرنے کی وجہ سے صحافیوں پر تشدد میں اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے جبکہ اس اضافے کی تازہ مثال حال ہی میں براہ راست دکھائے جانے والے ایک ٹی وی شو کے دوران ایک سیاستدان کی جانب سے سینئر صحافی پر تشدد کیا جانا ہے۔

جون کے آخری ہفتے میں نجی ٹی وی 'کے-21' کے ایک پروگرام کے دوران وفاقی حکمران جماعت پاکستان تحریک انصاف (پی ٹی آئی) کے رہنما مسرور سیال نے سینیئر صحافی اور کراچی پریس کلب کے صدر امتیاز خان فاران پر اس وقت حملہ کیا جب صحافی نے خیبر پختونخوا کے دارالحکومت پشاور میں تاخیر کے شکار میٹرو بس منصوبے پر تجزیہ کیا۔

مسرور سیال نے امتیاز خان فاران پر جانبدارانہ تجزیہ کرنے کا الزام لگاتے ہوئے پہلے ان کے خلاف نازیبا زبان کا استعمال کیا، بعد ازاں طیش میں آ کر ان پر حملہ کر دیا۔

صحافی پر تشدد اور ان کے ساتھ بدکلامی پر اگرچہ تحریک انصاف نے مسرور سیال کی پارٹی رکنیت معطل کر دی تھی اور خود بھی انہوں نے صحافی سے معذرت کر لی تھی، تاہم یہ سوال اپنی جگہ قائم رہا کہ آخر سیاستدان یا دوسرے طاقتور افراد رپورٹنگ کرنے، سوال اٹھانے یا تجزیہ کرنے پر صحافیوں کو ہی کیوں نشانہ بناتے ہیں؟

اس کا جواب دیتے ہوئے تجزیہ کار اور کالم نگار سکندر تنیو کہتے ہیں کہ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ صحافی سیاستدانوں یا اقتدار میں بیٹھے لوگوں سے نااہلی پر کڑے سوالات کرتے ہیں اور ان سے حساب مانگنے کی طاقت رکھتے ہیں، کیوں کہ وہ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں۔

لیکن اگر پاکستان میں صحافیوں پر تشدد کے واقعات پر نظر دوڑائی جاتے تو یہ انکشاف ہوگا کہ امتیاز خان فاران پر ٹی وی پروگرام کے دوران حملہ صحافیوں کی حرمت، پیشے اور زندگی پر پہلا حملہ نہیں تھا۔

اگر پاکستان میں صحافیوں اور صحافتی اداروں پر تشدد کے گزشتہ برس کے واقعات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ صرف 2018 میں ہی پاکستان بھر میں سیاستدان، بااثر افراد، پولیس اور دیگر حکومتی عہدیداروں کی جانب سے 50 کے قریب صحافیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

صحافتی اداروں اور صحافیوں کے تحفظ پر کام کرنے والے ادارے پاکستان پریس فاؤنڈیشن کی 'اسٹیٹ آف پاکستانی میڈیا' نامی گزشتہ برس جاری کی گئی رپورٹ کے مطابق ملک بھر میں 2018 کے دوران صحافیوں پر جسمانی تشدد اور انہیں ہراساں کیے جانے کے 47 واقعات رپورٹ ہوئے۔

رپورٹ کے مطابق گزشتہ برس ملک بھر میں 22 صحافیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا، جن میں سے 5 صحافی شدید زخمی ہوئے، ساتھ ہی صحافیوں کو ہراساں کرنے اور انہیں مارنے پیٹنے کے دیگر 25 واقعات بھی رپورٹ کیے گئے۔

یہی نہیں بلکہ گزشتہ برس پاکستان میں 6 صحافیوں کو قتل بھی کیا گیا، جن صحافیوں کو قتل کیا گیا ان میں چارسدہ پریس کلب کے سیکریٹری جنرل احسان شیر پاؤ، روزنامہ پکار کے سب ایڈیٹر انجم منیر راجا، روزنامہ نوائے وقت کے رپورٹر ذیشان اشرف بٹ، روزنامہ نیا دور کے نمائندے عابد حسین، روزنامہ خبریں کے نمائندے محمد سعید بٹ اور روزنامہ کے ٹو ٹائمز، اے ٹی وی کے نمائندے محمد سہیل خان شامل ہیں۔

رپورٹ میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ 2018 میں مارے گئے ان 6 صحافیوں کو پیشہ ورانہ نہیں بلکہ ذاتی وجوہات کی بناء پر قتل کیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی اسی رپورٹ میں بتایا گیا کہ 2018 وہ پہلا سال نہیں تھا، جس میں صحافیوں کو قتل کیے جانے سمیت انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ پاکستانی میڈیا گزشتہ 71 برس سے تشدد، ہراساں کیے جانے اور خون کے واقعات کو برداشت کرتا آ رہا ہے۔

سال **2018** سے قبل **2017** میں بھی صحافیوں کو رپورٹنگ کرنے، سیاستدانوں کی کرپشن اور کرتوت عوام کو دکھائے جانے پر تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ رپورٹنگ کرنے اور مبینہ طور پر سیاستدانوں کی کرپشن کو سامنے لانے پر **2017** میں تشدد کا نشانہ بننے والے صحافیوں میں سندھ کے تیسرے بڑے شہر سکھر کے صحافی امداد پھلپوٹو بھی ہیں۔

پھلپوٹو کو سکھر پولیس نے جنوری 2017 میں تحویل میں لینے کے بعد تشدد کا نشانہ بنایا۔

امداد پھلپوٹو سکھر میں نجی ٹی وی چینل سماء کے اسٹیشن ہیڈ تھے، مبینہ طور پر پولیس نے انہیں بااثر سیاستدان اور حکمران جماعت کے مرکزی رہنما کہنے پر حراست میں لینے کے بعد 10 گھنٹوں تک حبس بیجا میں رکھا جبکہ ان پر بدترین تشدد کیا۔

پی پی ایف کے مطابق امداد پھلپوٹو کو مبینہ طور پر سیاسی رہنما کے خلاف مسلسل خبریں چلانے کے بعد اٹھایا گیا، بعد ازاں پولیس نے امداد پھلپوٹو کا مقدمہ دائر کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ واقعے کے حوالے سے امداد پھلپوٹو نے ڈان نیوز سے بات کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ پولیس نے انہیں بااثر سیاستدان کے خلاف خبریں شائع اور نشر کروانے پر نشانہ بنایا. ان کے مطابق پولیس نے ان کے گھر پر حملہ کر کے انہیں اور ان کے بھائیوں کو گرفتار کیا انہیں کئی گھنٹوں تک حبس بے جا میں رکھ کر تشدد کا نشانہ بنایا۔

ان کا کہنا تھا کہ پولیس نے انہیں صحافیوں اور میڈیا کے دباؤ پر اس وقت چھوڑا جب ان کے ٹی وی چینل نے انہیں حراست میں لیے جانے اور ان پر تشدد کی خبریں نشر کیں۔

ایک سوال کے جواب میں امداد پھلپوٹو نے بتایا کہ انہوں نے ابتدائی طور پر بااثر سیاستدان کے خلاف ایک اسکول کے پلاٹ پر قبضہ کر کے بنگلہ بنانے کی رپورٹ نشر کی، جس پر اس بااثر شخصیت نے چند صحافیوں کی تجویز پر ان کے خلاف پولیس کو کارروائی کرنے کی ہدایت کی۔ امداد پھلپوٹو نے الزام عائد کیا کہ سکھر کے چند نامور صحافی بھی پلاٹوں پر قبضے یا دیگر معاملات میں مقامی رہنما کا ساتھ دیتے رہے ہیں اور انہوں نے ہی سیاسی رہنما کو ان کے خلاف پولیس استعمال کرنے کی تجویز دی۔ پولیس کی جانب سے اٹھائے جانے اور پھر تشدد کا نشانہ بنائے جانے کے بعد امداد پھلپوٹو نے پولیس کے خلاف مقدمہ بھی دائر کروانے کی کوشش کی، تاہم ان کی ایف آئی آر درج نہیں کی گئی۔ پولیس کی جانب سے ایف آئی آر درج نہ کیے جانے کے خلاف امداد پھلپوٹو نے 2017 میں سندھ ہائی کورٹ سکھر بینچ میں درخواست دائر کی، لیکن بدقسمتی سے ان کی درخواست پر ابتدائی طور پر ایک یا دو سماعتیں ہونے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک اور کوئی سماعت نہیں ہوئی، تاہم اس دوران عدالت نے پولیس کو عدالتی حاضری کے لیے پابند بنا دیا۔ امداد پھلپوٹو کے مطابق انہیں گرفتار کرنے اور حبس بے جا میں رکھنے والے پولیس تھانے کے افسران اور اہلکار ڈیڑھ سال تک سندھ ہائی کورٹ میں حاضری بھرنے کے بعد تھک گئے اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے معافی مانگنے آئے۔

امداد پھلپوٹو پر پولیس تشدد کیس کا سین رواں برس مئی میں اس وقت ڈراپ ہوا جب متعلقہ تھانے کے پولیس اہلکار معززین علاقہ اور سماجی کارکنان کے ہمراہ قافلے کی صورت میں صحافی کے گھر پہنچے جبکہ انہیں غیر قانونی طریقے سے حراست میں لینے کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے معافی مانگی اور سندھ ہائی کورٹ میں دائر درخواست واپس لینے کی استدعا کی۔

امداد پھلپوٹو نے معزز شہریوں اور سماجی رہنماؤں کے قافلے کو احترام دیتے ہوئے پولیس اہلکاروں کو معاف کر دیا جبکہ ان کے خلاف عدالت میں دی گئی درخواست واپس لی، یوں پولیس اور امداد پھلپوٹو کے درمیان صلح ہوگئی۔

امداد پھلپوٹو کی جانب سے پولیس والوں سے صلح کیے جانے پر سندھی روزنامہ 'پنھنجی اخبار' سے وابستہ صحافی ثاقب سندیلو نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بیچارے صحافی پولیس اور وڈیروں کے آگے اتنے بے بس ہو جاتے ہیں کہ ان کے پاس صلح کرنے کے علاوہ اور کوئی آپشن ہی نہیں بچتا۔

انہوں نے کہا کہ صحافیوں کی جانب سے خود پر تشدد کرنے والے ملزمان سے صلح کرنے کا عمل یقیناً مایوس کن ہے لیکن زمینی حقائق یہی ثابت کرتے ہیں کہ صحافیوں کے پاس صلح کے سوا اور کوئی آپشن ہی نہیں بچتا۔

انہوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت کو صحافیوں پر ہونے والے تشدد یا انہیں ڈرانے دھمکانے کے کیسز سے متعلق کوئی جامع پالیسی مرتب کر کے ایسے کیسز کو ترجیحی بنیادوں پر سننے اور حل کرنے کے انتظامات کرنے چاہئیں، دوسری صورت میں صحافی امداد پھلپوٹو کی طرح صلح کرنے پر ہی اکتفا کریں گے۔

(بشکریہ ڈان)

کمسن بھائی کا اغواء اور قتل

حیدرآباد 9 جولائی کو حیدرآباد میں دس سالہ بھائی اور آٹھ سالہ بہن کو اغوا کے بعد قتل کر دیا گیا۔عبدالقادر کی لاش ملنے کے ایک روز بعد رخستان کی لاش بھی مل گئی۔ پولیس نے ایئرپورٹ روڈ سے بے ہوش اور زخمی حالت میں ملنے والے دس سالہ عبدالقادر کو سول ہسپتال حیدرآباد منتقل کر دیا جہاں بچے نے ہوش میں آنے کے بعد پولیس کو بیان ریکارڈ کروایا کہ وہ جی او آر کالونی کا رہائشی ہے۔ پڑوسی عثمان بنگالی نے بہن بھائیوں کو چیز دلانے کے بہانے موٹر سائیکل پر بٹھا کر ایئرپورٹ روڈ پر لے گیا اور مجھے چھری مار کر زخمی کر دیا جبکہ رخسار کو اپنے ساتھ لے گیا۔ پولیس نے بچے کے بیان کے بعد عثمان بنگالی اور اس کے ساتھی عبداللہ کو حراست میں لے لیا۔ اس کے بعد دس سالہ عبدالقادر سول ہسپتال میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔عبدالقادر کی موت کے دوسرے دن ہی رخسار کی تشدد زدہ لاش مل گئی۔ بی سیکشن تھانے کی حدود بسم اللہ سٹی بلاک اے ون سٹریٹ نمبر پانچ میں مقامی افراد کی نشاندہی پر پولیس نے زیر تعمیر مکان کی بالائی منزل سے رخسار کی تشدد زدہ لاش قبضہ میں لے کر پوسٹ مارٹم کروایا جس میں اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی بھی تصدیق ہوئی ہے۔ بچی کو تشدد کے بعد گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ آئی جی سندھ نے اس کا نوٹس لیتے ہوئے تفصیلی رپورٹ طلب کر لی اور پولیس افسران کو ہدایت کی کہ واقعے کی ہر پہلو سے تفتیش کی جائے اور قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا کر ورثاء کو انصاف فراہم کرنے کی تمام تر کوششیں بروئے کار لائی جائیں۔

(لالہ عبدالحلیم)

خاتون کو زیادتی کا نشانہ بنا ڈالا

ٹوبہ ٹیک سنگھ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نواحی گاؤں کالا پہاڑ میں گاؤں کے تین اوباش نوجوانوں نے شادی شدہ خاتون کو اس وقت زیادتی کا نشانہ بنا کر قتل کر ڈالا جب وہ کھیتوں میں کام کر رہی تھی۔واقعہ کی اطلاع ملنے پر تھانہ صدر پولیس نے موقع پر پہنچ کر قتل کی لرزہ خیز واردات کا جائزہ لیا اور مقتولہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ڈی ایچ کیو ہسپتال منتقل کر دیا۔دوسری جانب ورثا نے الزام عائد کیا ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں مقتولہ کے ساتھ زیادتی کی تصدیق اور ملزمان کی نشاندہی کے باوجود پولیس ملزمان کو گرفتار نہیں کر رہی۔متاثرہ خاندان نے پولیس رویہ کیخلاف احتجاج کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ پنجاب سمیت پولیس افسران سے انصاف کا مطالبہ کیا ہے۔

(اعجاز اقبال)

طالب علم اغواء

لکی مروت تجوڑی کے علاقے کوٹکہ یار خان آدمزئی سے تعلق رکھنے والا 13 سالہ طالب علم کو اغواء کر لیا گیا۔تفصیلات کے مطابق فواد خان اپنے کزن توفیق کے ہمراہ موٹر سائیکل پر سکول جا رہے تھے کہ راستے میں ناکہ کے قریب ملزم جمشید نے اسلحہ پر انہیں روکا اور جمشید کو موٹر سائیکل سمیت اپنے ساتھ لے گئے۔ طالب علم کے والد احمد خان نے پولیس کو بتایا کہ ملزمان پر پہلے ہی اغواء کا مقدمہ چل رہا ہے۔ پولیس نے ملزمان کے خلاف مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔طالب علم کے اغواء کا یہ واقع یکم جون کو پیش آیا۔

(محمد ظاہر)

ہسپتال میں سہولیات کا فقدان

بنوں بنوں ڈویژن کے واحد ویمن اینڈ چلڈرن ہسپتال میں مریض رل گئے۔ وومن اینڈ چلڈرن ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ آئے ہوئے لواحقین ہسپتال انتظامیہ پر برس پڑے اور میڈیا کو اپنی فریاد سناتے ہوئے کہا کہ شفاء کی غرض سے آتے ہیں، زہر پی کر واپس جاتے ہیں، نرسری وارڈ میں سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے پیدائشی بچوں کی اکثر اموات واقعہ ہوتی ہیں، گزشت روز بھی 2 بچے انتظام نہ ہونے کی وجہ سے موت کا شکار ہو گئے، ہسپتال میں صفائی کی ناقص صورتحال، جگہ جگہ نالیاں گندے پانی سے بھری پڑی ہیں، مریضوں اور لواحقین کیلئے صاف پانی تک میسر نہیں، ہسپتال میں قیمتی دوائیاں باہر سے منگوائی جاتی ہیں جبکہ اثر ورسوخ رکھنے والوں کو ہی ملتی ہیں۔کئی کئی دن سے ہسپتال میں مریض ہسپتال میں پڑے ہیں جنہیں ڈاکٹر اور نرسز کوئی توجہ نہیں دے رہے، انہوں نے کہا کہ مریضوں کو استعمال شدہ برنولہ لگائے جاتے ہیں جو جان لیوا بیماریوں کا سبب بن رہے ہیں، ہسپتال میں معمولی سی بیماری کے ٹیسٹ بھی باہر کی لیبارٹیوں سے کروانے پڑتے ہیں۔ ہسپتال کے ایم ایس نے موقف دیتے ہوئے بتایا کہ ہسپتال میں سٹاف کی کمی ہے اور موجودہ عملہ بھی پشاور اور سوات سے تعلق رکھتا ہے جو کہ عید کیلئے اپنے اپنے علاقوں میں چلے گئے ہیں۔

(نامہ نگار)

ٹیچر کا کمسن طالب علم پر تشدد

گوجرہ گوجرہ کے نواحی گاؤں میں سبق یاد نہ کرنے پر خاتون ٹیچر آسیہ نے کلاس ون کے طالب علم عثمان پر وحشیانہ تشدد کیا، ٹیچر کے بہیمانہ تشدد سے کمسن طالب علم کی حالت غیر ہو گئی، متاثرہ طالب علم کو فوری طور پر ٹی ایچ کیو اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے، سکول ٹیچر کے تشدد سے 5 سالہ عثمان کا بدن شدید زخمی ہو گیا، ٹی ایچ کیو اسپتال میں متاثرہ طالبعلم کو طبی امداد فراہم کی جا رہی ہے جبکہ والدین کی طرف سے ٹیچر کے خلاف کارروائی کے لئے درخواست دے دی گئی ہے، تاہم پولیس خاتون ٹیچر کو ابھی تک گرفتار نہیں کر سکی ہے۔

(اعجاز اقبال)

شہری گندہ پانی پینے پر مجبور

چترال اپر چترال میں کارگن کے عوام گندہ پانی پینے پر مجبور ہو گئے۔ شہریوں کا کہنا ہے کہ گاؤں کارگن کے پانی کی ٹینکی چوہوں اور کیڑے مکوڑوں سے بھری ہوئی ہے جس کی وجہ سے علاقے کے عوام یہ گندہ اور مضر صحت پانی پینے پر مجبور ہیں جس کی وجہ سے آئے دن مختلف بیماریاں پھیل رہی ہیں، انہوں نے ارباب اختیار سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ اس کا نوٹس لے کر جلد از جلد مسئلہ حل کیا جائے اور غریب عوام کو مرنے سے بچایا جائے۔ بصورت دیگر عوام احتجاج پر مجبور ہو جائیں گے۔

(روزنامہ آج)

ریلوے سٹیشن کی سڑک ٹوٹ پھوٹ کا شکار

لاہور ایک موریہ پُل اور ریلوے سٹیشن کی سیڑھیوں کا پل کئی ماہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور تعمیری کام میں تاخیر سے شمالی لاہور کی جانب ٹریفک جام معمول بن گیا۔ شدید گرمی میں گھنٹوں ٹریفک جام رہنے سے شہریوں کو شدید دشواری کا سامنا ہے۔ صرف 50 فٹ سڑک کا ٹکڑا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے جس کے باعث لوگوں کا ٹائر مارکیٹ کے علاقے سے گزرنا دشوار ہو رہا ہے۔ اعلیٰ حکام اس کا نوٹس لیں۔

(عبدالرؤف)

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1 تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2 ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقدارِ اعلی کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3 ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4 کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جاسکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5 کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6 ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7 قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8 ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، با اختیار قومی عدالتوں سے موئثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9 کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10 ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11 (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جاسکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12 کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھربار، خط و کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13 (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آجانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14 (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذارسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کاروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جاسکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15 (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16 (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17 (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18 ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتمائی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19 ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20 (1) ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

دفعہ - 21 (۱) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22 معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23 (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب و معقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جاسکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24 ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25 (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26 (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27 (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں

دفعہ - 28 ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہوسکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29 (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30 اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جاسکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

16 جولائی، لاہور: پاکستان کے عالمی قانونی فرائض پر تربیتی ورکشاپ

17 جولائی، لاہور: انسانی حقوق سے متعلق پاکستان کی عالمی ذمہ داریاں پر مشاورت منعقد کی گئی

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
"ایوان جمہور" 107۔ ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹائون، لاہور
فون: 35838341-35864994 فیکس: 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ: www.hrcp-web.org
پرنٹر: مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15